© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

اسی جون کے پہلے ہفتے میں خاص بیت المقدس میں جو اسلام کا قبلۂ اوّل ہے، نیز مصر، اردن اور شام میں اسرائیل کی جارحیت کے ہاتھوں جو تباہی ہوئی اس نے ایک بار پھر صلیبی جنگوں کی یاد تازہ کر دی ہے، جو اسی سرزمین میں آج سے آٹھ سو سال پہلے لڑی گئیں اور جن کا سلسلہ کوئی ڈیڑھ سو سال تک جاری رہا۔ صلیبی حملہ آور پہلے ہلّے میں بیت المقدس اور اس کے گرد و نواح کے علاقے پر قبضہ کر کے بیٹھ گئے۔ وہاں سے وہ ایک طرف شام پر اور دوسری طرف مصر پر برابر ترکتازیاں کرتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ تو صلیبی حملہ آور مصر کے مشہور شہر دمیاط پر قابض ہو گئے اور وہاں سے وہ قاہرہ کی طرف بڑھے۔ ان صلیبیوں کی پشت پر پورا یورپ تھا اور وہ انہیں برابر مدد دے رہا تھا۔ ایک حملے کے بعد دوسرا حملہ، اس کے بعد تیسرا حملہ اور اس طرح اس سرزمین پر جہاں جون کے پہلے ہفتے میں اسرائیل کے طیاروں اور اس کی فوجوں نے جارحانہ اقدام کیا، کوئی آٹھ صلیبی حملے ہوئے، جن میں برطانیہ کے بادشاہ رچرڈ سے لے کر جرمنی کے امراء اور خود فرانس کے بادشاہ لوئیس نہم نے حصّہ لیا۔

اسلام یورپ کی اس یلغار سے کس طرح بچا اور آخر مسلمان سرزمین مقدس کو اجنبی حملہ آوروں سے پاک کرنے میں کیسے کامیاب ہوئے، تاریخ اسلام میں ان جان گداز اور ساتھ ہی نہایت تابناک واقعات کی پوری تفصیل موجود ہے۔

اسرائیل کا اتنی کم تعداد میں ہونے کے باوجود اپنے ہمسایہ ملکوں مصر، اردن اور شام کے مقابلے میں جن کی آبادی اس سے کئی گنا زیادہ ہے۔ ۵ر جون کی صبح ہی سے جب کہ اس نے دھوکے سے اچانک ان ملکوں پر زبردست ہوائی حملے کر کے ان کی فضائی قوت کو تقریباً تباہ کر دیا، فوجی پلّہ بھاری ہو گیا تھا۔ اس کی ایک وجہ تو ظاہر ہے، اسرائیل جارحیت میں پہل کرنا تھا۔ اور اس فضائی قوت کے زمانے میں پہل کرنے والے بڑے فائدے میں رہتے ہیں، جیسے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دوسری جنگ عظیم میں نازی جرمنی روس پر اور جاپان امریکی بحری اڈے، پرل ہاربر اور سنگاپور پر سیل کر کے دنوں میں یلغار کرتے ہوئے کہیں سے کہیں پہنچ گئے تھے۔ اور دوسری وجہ جسے ہمیں خاص طور ذہن نشین کرنا چاہیئے، فن جنگ، سامان جنگ اور ٹیکنالوجی میں اسرائیل کی برتری ہے اور یہ برتری محض ایک خارجی چیز نہیں کہ اسے باہر سے لے کر بہم کر لیا جائے۔ یہ ایک قوم کی ذاتی صلاحیتوں اور معاشرتی نظام کا عملی مظاہرہ ہوتا ہے۔

۱۹۴۸ء، پھر ۱۹۵۶ء اور اب جون ۱۹۶۷ء میں اسی ٹیکنالوجی کی برتری کی وجہ سے، اس کے ساتھ، بے شک اسرائیل کا دھوکا سے پہلے حملہ کرنا اور چند بڑی زبر دست طاقتوں کی اس کی پشت پناہی بھی شامل ہے، وہ غالب رہا ہے اور عربوں کو اس کے مقابلے میں پسپا ہونا پڑا۔

ان معرکوں میں ایک طرف مسلمان ممالک تھے اور مسلمان قومیں بحیثیت مجموعی گزشتہ دو صدیوں سے فنون جنگ، ٹیکنالوجی اور ان سے متعلقہ شعبوں میں یورپ سے پیچھے ہیں، اور وہ اب تک اس پس ماندگی کو دور نہیں کر پائیں، اور دوسری طرف اسرائیل کی شکل میں یورپ اور امریکہ کی ترقی یافتہ ٹیکنالوجی اور جنگ کی فنی مہارت تھی، اور یقیناً ان کی مالی اور اخلاقی امداد بھی تھی دو ڈھائی سو سال پہلے مثال کے طور پر یورپ میں عثمانی ترک اور ادھر برصغیر پاک و ہند میں مغل بہت بڑی فوجی طاقتیں تھیں۔ عثمانی ترک اناطولیہ سے نکل کر پورے مشرقی یورپ پر قابض ہو گئے تھے۔ اور آسٹریا کا پایۂ تخت وی آنا بڑی مشکل سے ان کی دست بُرد سے بچا تھا۔ لیکن پھر وہ وقت آیا کہ عثمانی ترک جو فنونِ حرب میں یورپ سے آگے تھے اور ان کا معاشرتی نظام اس زمانے کے یورپ سے کہیں زیادہ مربوط، زیادہ متحد کرنے والا اور زیادہ جاندار تھا، جمود کا شکار ہو گئے۔ ایک طرف ان کے اندر معاشرتی اختلال و انحطاط نے راہ پائی، تو دوسری طرف جنگ کے ہتھیاروں اور جنگ کے طریقوں میں وہ لکیر کے فقیر بن گئے ان کے مقابلے میں یورپ آگے بڑھتا گیا۔ اس نے فوجوں کو نئی طرح منظم کیا۔ نئے سے نئے ہتھیار بنائے، بحری قوت میں اضافہ کیا اور جس چیز کو ہم آج ٹیکنالوجی کا نام دیتے ہیں جس میں کہ سائنسی، فنی، مشینی اور خود انسانی مہارت سب کی سب آجاتی ہے، اسے یورپ نے حاصل کر کے اس میں کمال پیدا کیا۔

عثمانی ترکوں کو یورپ کے مقابلے میں اپنی اس کمزوری کا احساس ۱۷۷۴ء کے صلح نامہ کیناری جی کے بعد سے لیں، روس سے بُری طرح شکست کھانے کے بعد انھوں نے کیا تھا۔ اس سے پہلے یورپ عثمانیوں کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فوجی طاقت سے مرعوب تھا، لیکن اس جنگ نے یورپ پر ان کی کمزوری واشگاف کردی اور اب ہر یورپی قوم اس موقع کی تلاش میں رہنے لگی کہ وہ عثمانی مقبوضات کے کسی حصے پر چڑھ دوڑے اور اسے ہتھیا لے۔

۱۷۷۴ء کے بعد ترکوں نے اپنی برّی اور بحری فوجوں کی تنظیم نو شروع کی۔ اور اس میں انھوں نے یورپ کے ماہرین سے مدد بھی لی۔ سلطان سلیم ثالث نے برّی اور بحری فوج کی تربیت کے مراکز قائم کیے اور ان میں فرانسیسی ماہروں کو رکھا۔ یہ ۱۷۹۳ء کا زمانہ ہے۔ عثمانیوں نے ایک حد تک اور یہ بھی صرف ایک حد تک یورپ کی جنگی فنی مہارت کو اپنایا اور اسی سے وہ اس قابل ہوئے کہ عثمانی سلطنت کے بہت بڑے رقبوں کو کھو کر کسی نہ کسی طرح خاص ترکی کی آزادی کو محفوظ رکھ سکے اور دوسرے مسلمان ملکوں کی طرح یورپی قوموں کے براہ راست محکوم نہیں ہوئے۔ لیکن برّصغیر کے مسلمان حکمرانوں نے ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی سے کوئی سبق نہ لیا اور انھوں نے یورپ جن ہتھیاروں اور جن فنون حرب سے مسلح ہو کر حملہ آور ہو رہا تھا۔ انہیں اپنانے کی باقاعدہ اور مثبت کوشش نہ کی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تقریباً دو سو سال تک یہ سرزمین انگریزوں کے زیر تسلط رہی۔

یورپ میں فنون جنگ اور ٹیکنالوجی کو جو ترقی ہوئی۔ اور گزشتہ دو سو سال سے اس میں جو برابر ترقی ہو رہی ہے، تو اس کا بہت بڑا سبب اور محرک وہاں کا بدلا ہوا اور ترقی پذیر معاشرتی نظام ہے۔ یہاں یورپ سے مراد امریکہ اور روس اور مشرقی یورپ کے وہ ملک بھی ہیں، جہاں صنعتی انقلاب بروئے کار آ چکا ہے اور وہ ٹیکنالوجی میں مغربی یورپ سے اب پیچھے نہیں ہیں۔ اس معاشرتی نظام میں آبادی کے مختلف طبقات کے باہمی رشتے بھی ہیں۔ معاشرہ میں عورتیں ہر لحاظ سے جو اپنے پاؤں پر کھڑی ہو رہی ہیں، یہ صورت حال بھی ہے اور سب سے زیادہ ان ملکوں کا تعلیمی و معاشی نظام ہے۔ ان سب چیزوں نے نیز گزشتہ دو صدیوں کے معاشرتی ارتقاء نے یورپ کو وہ ٹیکنالوجی دی ہے جس سے آج مسلح ہو کر یورپ اور امریکہ سے آنے والے اسرائیلی مشرق قریب میں دندنا رہے ہیں، اور ان کے عزائم یہ ہیں کہ ایک طرف دریائے نیل سے لے کر عراق کی سرحدوں تک اور دوسری طرف بحیرہ روم سے مدینہ منورہ تک اسرائیلی سلطنت قائم کریں جس کی پشت پر ایک تو خود صہیونیوں کی اپنی قوت ہو، اور دوسرے امریکہ اور برطانیہ اس کی پشت پر ہوں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۱۷۵۷ء کے بعد بدقسمتی سے برّصغیر والوں کی آنکھیں نہ کھلیں اور اس کا خمیازہ انہیں آخر بھگتنا پڑا۔ گو ۱۷۷۴ء کی شکست کے بعد بعض عثمانی مدبروں اور خود سلطان سلیم ثالث نے اصلاح احوال کی کوشش شروع کی اور ترکی میں "نظام جدید" کے نام سے نئی فوج بھی وجود میں آئی، لیکن چونکہ ترکی معاشرہ انتہائی قدامت پرست اور جمود پسند تھا، اور اس پر رجعت پسند علماء پوری طرح حاوی تھے، اس لئے یہ اصلاحی کوششیں زیادہ آگے نہ جا سکیں اور ترکوں کی قدیم بے ضابطہ فوج اور رجعت پسند علماء نے مل کر سلطان کے خلاف بغاوت کی، اور اسے برطرف کر دیا۔ اس طرح سلطان سلیم کے فوجی کالجوں اور "نظام جدید" سے ترکوں کی جو نئی نسل پیدا ہوتی، فی الحال اس کا امکان ختم ہو گیا۔ رجعت پرستی اقدام پسندی اور تجدد پر غالب آئی اور ترکی میں وہ معاشرتی انقلاب نہ آسکا، جیسا کہ یورپ میں آیا تھا، اور جس کا ثمر سائنس کی ترقی اور ٹیکنالوجی کے فروغ کی صورت میں نکلا تھا۔

باغی ینی چری فوج کے افسروں نے ۲۹ مئی ۱۸۰۷ء کو ترکی کے مفتی اعظم کے سامنے یہ سوال پیش کیا تھا:۔ "کیا ایک سلطان جس نے اپنے اقدامات اور احکام سے ان مذہبی اصولوں کی جن کا قرآن نے حکم دیا ہے، خلاف ورزی کی ہے، برسر اقتدار رہ سکتا ہے؟" مفتی اعظم کو مجبوراً سلطان کی برطرفی کا فتویٰ دینا پڑا۔ باغی فوجوں کے بعض دستوں کو سلطان سے یہ بھی شکایت تھی کہ انہیں یورپی طرز کی وردیاں پہننے کا حکم دیا گیا ہے اسی دَور کا ایک ترکی مورخ احمد عاصم آفندی ۱۷۹۱ء - ۱۸۰۸ء کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے سلطان سلیم کی اصلاحات کو سراہتا ہے اور کہتا ہے کہ اس سے عثمانی سلطنت کی فوجی قوت بحال ہو سکے گی۔ اس کے ساتھ ہی وہ روس کا ذکر کرتا ہے کہ کس طرح وہ یورپ کی سائنس اور ٹیکنالوجی کو مستعار لے کر کمزوری اور وحشت سے نکل کر ایک طاقتور سلطنت بن گیا ہے

کاش سلطان سلیم ثالث کی فوجی اصلاحات اور اس کے "نظام جدید" کی راہ میں رجعت پسند ینی چری اور علماء آڑے نہ آتے اور جہاں ترکی میں جنگی فنون اور ٹیکنالوجی آ رہی تھی، اس کے ساتھ اس معاشرتی انقلاب کے محرکات بھی آتے، جنہوں نے یورپ کو صحیح معنوں میں داخلی قوت اور فوجی برتری دی تھی۔

ایک قوم کی اصل طاقت اس کا مربوط، توانا اور آگے بڑھنے والا معاشرہ ہوتا ہے اور اسی سے اکثر اسلامی ملک محروم ہیں، اور باوجود دوسرے ملکوں سے جدید ترین اسلحہ درآمد کرنے کے جب بھی یورپی ٹیکنالوجی سے لیس اسرائیل جیسی کسی طاقت سے ان کا مقابلہ ہوتا ہے، تو وہ بھاری نقصان اٹھاتے ہیں۔ یہ کمزوری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لڑنے والی فوج کی نہیں۔ ہماری افواج دنیا کی کسی بھی فوج سے کم لڑنے والی نہیں، دراصل یہ کمزوری ہماری وہ کوتاہی ہے جس کی وجہ سے ہم اب تک یورپی ٹیکنالوجی کے پوری طرح مالک نہیں بن سکے۔
یہ کوتاہی صرف اس معاشرتی انقلاب سے دُور ہو سکتی ہے، جس کی ضرورت پر ان صفحات میں برابر زور دیا جا رہا ہے یہ معاشرتی انقلاب ہمہ جہتی اور ہمہ گیر ہونا چاہیئے، جو افراد اور قوم کی زندگی کے ہر شعبے کو متحرک، فعّال، خلاق اور چاک و چوبند بنائے۔

ماہ جون کے ابتدائی دنوں میں مشرق قریب میں جو کچھ ہوا، یہ ایسا سانحہ نہیں کہ اسے عرب بالخصوص اور دنیا بھر کے مسلمان بالعموم کبھی بھلا سکیں۔ یہ واقعات اسلامی تاریخ میں ہمیشہ ایک خونیں باب کے طور رہیں گے اور جس طرح ہم اپنی طویل ملّی تاریخ میں بعض بڑے بڑے المیوں کو یاد رکھتے ہیں، اسی طرح اسرائیل کی بھی یہ سفاکانہ جارحیت اور اسلام کے مقدس [illegible] کہ اس سے جو تباہی و بربادی ہوئی، یہ المیہ ہمیشہ یاد رہے گا۔ اس میں ہمارے لئے بڑی عبرتیں اور مؤثر سبق [illegible] کرے، یہ ہماری ملّت کا آخری المیہ ہو اور یہ ہمارے لئے محرک بنے اس بات کا کہ ہم فنون جنگ، سامان جنگ، ٹیکنالوجی اور ان سے متعلقہ امور میں دشمنوں سے پیچھے نہ رہیں، اور ہم اپنے معاشرہ کو اس طرح بدلیں کہ ہمارے ہاں یہ علوم و فنون اور ٹیکنالوجی فروغ پا سکیں۔ کیونکہ اس دَور میں، اس طرح کی جارحیت سے وہی قوم محفوظ رہ سکتی ہے جو ان چیزوں میں اپنے دشمنوں کا پورا مقابلہ کرنے کے قابل ہو۔

مشرق قریب کے المناک سانحہ کو دیکھتے ہوئے کوئی ملک بھی جو اتفاق سے چند بڑوں میں سے نہیں، اپنے دشمن ہمسایوں سے اپنے آپ کو محفوظ نہیں محسوس کر سکتا، اور یقیناً اسے اس قسم کی جارحیت کا مقابلہ کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہنا چاہیئے۔ بے شک پاکستان کے معاشرے میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں، جو سائنس اور ٹیکنالوجی کی بنیادوں پر اس کے ایک مضبوط ملک بننے میں حائل ہو رہی ہیں، لیکن بدقسمتی سے ہمارے اکثر دینی رسائل جو صحیح معنوں میں دینی کم اور حزبی اور نعرہ بازی سیاست کے آرگن زیادہ ہیں، پاکستانی قوم کے اس موت اور زندگی کے مسئلے سے بالکل بے پروا ہیں، اور ان کی تمام تر تحریریں ایسی فضا پیدا کرنے میں لگی ہوتی ہیں، جن سے کہ نہ کبھی یہ قوم ایک متحد قوم بنے۔ نہ یہاں کی معیشت ترقی کرے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہ یہاں وسیع پیمانے پر صنعتیں لگ سکیں اور نہ یہاں تعلیم یافتہ طبقوں میں زندگی کے بارے میں سائنسی نقطۂ نظر فروغ پا سکے۔ ارباب مذہب کے اس طبقے کی ان قلمی، لسانی اور تدریسی مہموں کی موجودگی میں یہ توقع کرنا کہ پاکستان اپنے معاشرے کی موجودہ خرابیوں کو دُور کر کے ایک مضبوط اور ترقی یافتہ مملکت بن سکے گا، کافی مشکل نظر آتا ہے۔ یقیناً اسلام میں مختلف مذہبی فرقے موجود ہیں اور ان کی موجودگی کا انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن آج ضرورت اس کی ہے کہ پاکستانی اسلامی قومیت مقدم ہو اور ان فرقوں کی حیثیت اس کے ضمنی اجزا کی ہو، لیکن اسلام کے نام سے فرقہ وارانہ منافرت کو بعض مذہبی حلقوں میں جس طرح ہوا دی جا رہی ہے، یہ تو خود اس مملکت کی سالمیت پر ایک ضرب ہے جس سے کہ داخلی تفرقہ و انتشار بڑھے گا اور ملک کمزور ہو گا۔

پھر ہمارے ہاں کے نام نہاد دینی مدارس میں جو تعلیم دی جاتی ہے، ان پر پبلک کا جو بے اندازہ روپیہ صرف ہوتا ہے، اور ان مدارس سے جو ہزارہا طالب علم فارغ التحصیل ہوتے ہیں، جن کا اس معاشرے میں کوئی مصرف نہیں ہوتا اور نہ وہ اس میں کوئی مفید اور مثبت کام کر سکتے ہیں، بلکہ ان سے فرقہ وارانہ تفرقہ اور بڑھتا ہے، اور تعمیری و ترقیاتی کوششوں کی اور نفی ہوتی ہے، اتنے بڑے مالی، انسانی اور وقت کے ضیاع کے بعد بھی جو روز افزوں ہے، یہ سمجھنا کہ یہ ملک مضبوط ہو گا اور دشمنوں سے محفوظ رہ سکے گا، نری خام خیالی ہے۔

جب پاکستان بنا تھا، تو ان علاقوں میں مسلمانوں کا صرف ایک آدھ بنک تھا، اور بنک کا کام کرنے والا مسلمان عملہ تو سرے سے تھا ہی نہیں۔ ان بیس سالوں میں پاکستان میں بنک کاری نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ اور اب سرمایہ صندوقوں میں بند رہنے اور زمین کے اندر مدفون ہونے کے بجائے کاروباروں اور صنعتوں میں لگ رہا ہے، بے شک بنکوں کے نظام میں اصلاح ہونی چاہیئے، لیکن اگر سرے سے بنک ہی قائم نہ ہوتے، تو اصلاح کس کی ہوتی، لیکن مولانا مودودی کا ارشاد ہے:۔ "موجودہ زمانے کے بنکوں کی اصل خرابی یہ ہے کہ وہ سود کے ذریعے سے سارا کاروبار چلاتے ہیں۔ اور روپیہ بھی سُود کے نام پر جمع کیا جاتا ہے۔ ان حالات میں موجودہ بنکوں کی ملازمت ایسی ہے جیسے کوئی قحبہ خانے یا شراب خانے میں ملازمت کرے۔"

ذرا اندازہ لگائیے کہ وہ لاکھوں مسلمان جو سیدھے سادے مسلمان ہیں، خدا اور اُس کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے لائے ہوئے دین اسلام پر ان کا ایمان ہے، اور وہ ان بنکوں میں کام کرتے ہیں، اس "فتوے" کے بعد ان کی کیا ذہنی اور قلبی کیفیت ہوگی۔ ہمارے جیسے معاشرے میں بنک کاری صنعتوں کے قیام کی طرف پہلا قدم ہے، جب اس سے تعلق کو اسلام کی رُو سے قحبہ خانے یا شراب خانے کی ملازمت قرار دیا جائے گا، تو اس کا کیا اثر ہو گا۔

سرعت سے بڑھتی ہوئی آبادی کو روکنا ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا تعلق ملک کی معیشت، اجتماعیت اور دفاع سب سے ہے۔ جب آبادی ملک کے وسائل سے بہت زیادہ ہو گی تو آپ انہیں کہاں سے کھلائیں گے، کیسے تعلیم دیں گے، ان کے رہنے کا کس طرح انتظام کریں گے اور پھر ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے بعد آپ کے پاس کیا بچے گا کہ اس سے اسلحہ بنائیں یا انہیں درآمد کریں۔ نیم بھوکی، نیم ننگی، اَن پڑھ اور فلاکت زدہ کثیر آبادی اس ٹیکنالوجی کے دور میں آخر کس کام آسکتی ہے۔

کئی دوسرے مسلم اور غیر مسلم ملکوں کی طرح پاکستان میں بھی اضافہ آبادی کو کنٹرول کیا جا رہا ہے اور اس کی اشد ضرورت اور غیر معمولی اہمیت سے انکار کرنا حقائق سے انکار کرنا ہے۔ مولانا مودودی صاحب سے حال میں یہ سوال کیا گیا۔

س: "خاندانی منصوبہ بندی کے بارے میں اسلام کے احکامات کیا ہیں۔ براہ مہربانی وضاحت فرمائیں"۔

ج: "اگر حضورؐ کے زمانے میں ایسی کوئی تحریک اٹھتی، تو میرا خیال ہے کہ آپؐ اسی انداز سے اس کے خلاف جہاد کرتے، جس طرح آپؐ نے شرک کے خلاف جہاد کیا تھا۔ جس طرح شرک عقائد کے لئے تباہ کن ہے، اسی طرح خاندانی منصوبہ بندی اخلاق کے لئے تباہ کن ہے"۔

یہ تو ہمارے ان بزرگوں کی "خدمت اسلام" اور "سعیٔ استحکام پاکستان" کی چند مثالیں ہیں، لیکن اگر زیادہ تفصیل درکار ہو، تو ایسے کارناموں کے دفتر کے دفتر پیش کئے جا سکتے ہیں۔

آخر میں صرف یہ سوال ہے کہ ان حالات میں پاکستان کا معاشرہ ٹیکنالوجی کو اس کے وسیع تر معنوں میں کبھی اپنانے میں کامیاب ہو سکے گا اور اگر ایسا نہیں، تو کیا اس بارے میں کچھ کرنے کی ضرورت ہے یا نہیں؟

© rasailojaraid.com